سیّد جمال الدّین افغانی

☆ ــــــــــ محمّد سرور

سیّد جمال الدّین افغانی ۱۲۵۴ھ، ۱۸۳۸ء میں افغانستان کے ایک گاؤں اسد آباد میں پیدا ہوئے۔ اپنی غیر معمولی ذہانت کی وجہ سے انھوں نے چھوٹی عمر ہی میں، مروّجہ علوم میں تکمیل کر لی۔ وہ اٹھارہ سال کے تھے کہ ہندوستان آئے، وہاں انھوں نے کوئی ڈیڑھ سال قیام فرمایا۔[1]

اس کے بعد فریضۂ حج ادا کرنے وہ عازمِ حجاز ہوئے۔ سید جمال الدّین افغانی نے جزیرۂ عرب کی بھی کافی سیّاحت کی۔ حج سے فراغت کے بعد آپ افغانستان چلے گئے، اور وہاں حکومت کے اعلیٰ عہدے پر فائز ہوئے۔

سیّد جمال الدین افغانی نے جس علمی ماحول میں آنکھیں کھولیں، وہاں دوسرے اسلامی ممالک سے

---

[1] معلوم ہوتا ہے، ہندوستان میں وہ پہلی بار یورپی علوم سے واقف ہوئے۔ وہ ہندوستان میں کہاں ٹھہرے اور کس کس سے ملے؟ اس کی کوئی تفصیلات نہیں ملتیں۔ لیکن ہندوستان کے اس قیام سے انھوں نے جو فائدہ اٹھایا، اس کا ذکر اپنے مشہور رسالے العروۃ الوثقیٰ میں، جو سیّد صاحب نے اپنے شاگرد شیخ محمّد عبدہ کے ساتھ مل کر پیرس سے نکالا تھا، (ان الفاظ میں) کرتے ہیں: "میں نے مشرق اور اس کے باشندوں کی طرف نظر دوڑائی، تو سرزمینِ افاغنہ نے اپنی طرف مجھے متوجہ کیا، اور وہ پہلی زمین ہے، جس کی مٹی نے میرے جسم کو چھوا۔ اس کے بعد ہندوستان آتا ہے، جہاں میری عقل کی تربیت ہوئی پھر ایران ہے ۔ ۔ ۔ ۔" العروۃ الوثقیٰ کے بارے میں شیخ محمّد عبدہ نے ایک دفعہ فرمایا تھا، کہ اس میں جن خیالات کا اظہار کیا گیا، ان میں سے کوئی بھی میرا نہیں، اور جو تحریریں اس میں چھپیں، ان میں سے کوئی بھی سیّد صاحب کی نہیں۔

زیادہ فلسفہ وحکمت کی تعلیم پر زور دیا جاتا تھا۔ افغانستان کے مشہور عالم ومحقق صلاح الدین سلجوقی سیّد صاحب کے سوانح حالات میں لکھتے ہیں کہ سترھویں صدی عیسوی سے افغانستان اور شمالی ہندوستان میں منطق وفلسفہ کی تعلیم کی طرف خاص رجحان پیدا ہوگیا تھا۔ چنانچہ حالت یہ تھی کہ علمِ کلام فلسفہ سے بھرپور تھا۔ فلسفہ تصوف بالخصوص اس کے وحدت الوجود کے تصور سے متاثر تھا۔ اور ادب وشعر وحدت الوجود کی عکاسی کرتا تھا۔ یہ علمی خصوصیت صرف ان علاقوں میں پائی جاتی تھی۔ اور عربی ممالک اس سے بالعموم خالی تھے۔ درس وتدریس کے اس رجحان کی بنیاد دراصل بوعلی سینا نے اپنی کتاب "الاشارات" میں رکھی۔ اس کے بعد جلال الدین دوّانی، شیخ شہاب الدین سہروردی، مُلّا صدرا، محمد جونپوری اور انہیں کے پائے کے دوسرے حضرات اسی راہ پر چلے۔ یہ حضرات علماء بھی تھے، فلسفی بھی اور متکلم، صوفی اور ادیب بھی۔

اس کے بعد سلجوقی صاحب سیّد جمال الدین افغانی کی تعلیمی زندگی کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:۔ انھوں نے ایک عام افغانی طالب علم کی طرح علوم دینیہ، فلسفہ، تصوف اور ادب کی تحصیل کی۔ اور ان میں درجہ تکمیل حاصل کیا۔ میں نے سنا ہے کہ سیّد صاحب نے قاضی بشد (؟) حافظ دراز اور حبیب اللہ قندھاری سے پڑھا تھا۔ لیکن اس بارے میں ان کی خصوصیت یہ تھی کہ قدیم فلسفیوں کی طرح ان کے مطالعے کا محور زیادہ تر اجتماعی وسیاسی امور رہے۔ اور ان امور میں ان کے پیش نظر وہ مقصد تھا، جسے ابوعلی بن مسکویہ "کمال" سے تعبیر کرتا ہے۔[1]

سیّد جمال الدّین افغانی کی ذہنی زندگی کا یہ نقطہ آغاز تھا۔ اس کے بعد وہ ملکوں ملکوں پھرے۔ انہیں زندگی کے نئے نئے تجربے ہوئے اور اس طرح ان کی علم وفکر کی حدیں وسیع ہوتی گئیں۔

افغانستان میں اس وقت امیر دوست محمّد خان کی حکومت تھی۔ اور سید صاحب جیسا کہ اوپر ذکر ہوا اس میں ایک بڑے عہدے پر فائز تھے۔ امیر دوست محمد خان کے مرنے کے بعد اس کے بیٹوں میں خانہ جنگی شروع ہوگئی۔ سیّد صاحب محمد اعظم خان کے ساتھ تھے۔ اسے اس کے بھائی شیر علی خان نے انگریزوں کی مدد سے شکست دے دی، اور وہ ایران چلا گیا۔ سید صاحب اس کے بعد کابل میں ہی رہے۔ پھر حج کے ارادے

---

[1] جمال الدین افغانی بقلم محمد ابوریہ۔ مطبوعہ قاہرہ

سے دوسری بار ہندوستان آئے۔ اس دفعہ ہندوستان میں آپ کا صرف ایک ماہ قیام رہا۔ ہندوستان میں پہلی بار سیّد صاحب ۱۸۵۷ء کے لگ بھگ تشریف لائے تھے اور دوسری بار ۱۸۶۹ء میں۔ وہاں سے آپ نے مصر کا قصد کیا مصر میں سیّد صاحب صرف چالیس روز ٹھہرے۔ اس دوران میں وہ جامعہ ازہر آتے جاتے رہے اور زیادہ تر شامی طلبہ ان سے ملے بلکہ بعض نے ان سے کتاب شرح الاظہار کے کچھ سبق بھی پڑھے [1] مصر سے سید جمال الدین استنبول گئے۔ وہاں ان کی کافی آؤ بھگت ہوئی، اور انہیں مجلس تعلیمات کا رکن مقرر کیا گیا۔ لیکن ترکی کا شیخ الاسلام ان کے بڑھتے ہوئے اثر و نفوذ کو دیکھ کر ان سے خار کھانے لگا اور ان کی ایک تقریر کے بعض جملوں کو غلط معنی پہنا کر ان کے خلاف ہنگامہ کھڑا کر دیا۔ مجبوراً سید صاحب کو استنبول چھوڑنا پڑا۔ استنبول سے وہ ۱۸۷۱ء میں مصر آ گئے۔ اس دفعہ وہ مصر میں پورے آٹھ برس رہے۔ اور واقعہ یہ ہے کہ ان آٹھ سالوں میں سیّد صاحب کی تعلیمات سے سب سے زیادہ فائدہ مصر نے اٹھایا اور وہاں جو دینی اصلاح کا جذبہ، ذہنی بیداری، سیاسی شعور اور عربی ادب و انشا کا نیا اسلوب پیدا ہوا، وہ سب سید صاحب اور ان سے استفادہ کرنے والوں ہی کی کوششوں کا نتیجہ تھا۔

مصر میں سید جمال الدین افغانی کے پائے کے عالم دین کے لئے موزوں ترین جگہ جامعہ ازہر تھی، لیکن علمائے ازہر کو سیّد صاحب کا کتبِ فلسفہ کی تعلیم دینا پسند نہ تھا، کیونکہ اس زمانے میں کتب فلسفہ سے دلچسپی رکھنے والے کو زندیق اور کافر سمجھا جاتا تھا، جیسا کہ اس وقت ایک شاعر نے کہا تھا:-

ومن یقل بالطبع او بالعلۃ　　فذاک کفر عند اهل الملۃ

(جو طبیعت اور علّت و معلول کی بات کرے، تو وہ اہل ملّت کے نزدیک کفر ہے)

یہ صورت حال دیکھ کر سیّد صاحب نے اپنے گھر پر ہی تعلیم و تدریس کا سلسلہ شروع کر دیا۔ گو علمائے ازہر اس سے بڑے برافروختہ ہوئے، لیکن سید صاحب نے اس کی مطلق پروا نہ کی۔ ان کے درس میں علماء میں سے بہت کم اور غیر علماء تعلیم یافتہ طبقے میں سے کافی لوگ آنے لگے اور اس طرح سیّد صاحب کا حلقہ اثر وسیع ہوتا گیا۔ وہ صرف کتابیں نہیں پڑھاتے تھے، بلکہ اس کے ساتھ ساتھ اپنے شاگردوں میں ایک نئی روح بھی پیدا کرتے تھے۔ دینی اصلاح کی روح، اجتماعی و سیاسی امور کو بدلنے کی روح اور اپنے خیالات کو

---

[1] جمال الدین افغانی بقلم محمد البوریہ۔ مطبوعہ قاہرہ

زبان و قلم سے دوسروں تک پہنچانے کی روح۔

سیّد صاحب اپنے درس و تدریس میں ایک طرف جمود فکری اور تقلید اعمیٰ کی مخالفت کرتے اور دوسری طرف خدیو اسماعیل جو اس وقت مصر کا فرمانروا تھا، اس کے استبداد پر برسا کرتے اور اہل مصر کے لئے ذمّہ دار حکومت کے قیام کی ضرورت پر زور دیتے۔ شیخ محمد عبدہ نے اپنے استاد کی ان سرگرمیوں کا اسی زمانے میں ان الفاظ میں ذکر کیا تھا۔

سیّد جمال الدّین مصر آئے۔ ان کا ارادہ یہاں قیام کا نہ تھا، لیکن جب وہ وزیر اعظم ریاض پاشا سے ملے، تو اس نے انہیں قیامِ مصر پر آمادہ کرلیا۔ اور ان کے لئے ایک ہزار قرش مصری وظیفہ مقرر کیا۔ ان کے اس زمانہ قیام میں بہت سے طالب علموں نے ان کا رُخ کیا اور ان سے علم کلام، نظری حکمت' طبیعیات' عقلیات، ہیئت، علم تصوف اور اصول فقہ اسلامی کے فنون کی اعلیٰ کتابیں پڑھیں۔ اس تمام عرصے میں از اوّل تا آخر ان کا گھر ہی ان کا مدرسہ تھا۔ وہ کبھی ازہر میں پڑھانے کے لئے نہیں گئے۔ البتہ کبھی کبھی اسے دیکھنے ضرور جاتے۔ اور زیادہ تر وہ جمعہ کے دن وہاں جایا کرتے تھے۔

طالب علموں کے دلوں میں سیّد صاحب کی عظیم شخصیّت کا نقش بیٹھ گیا۔ اور انھوں نے ان سے بہت کچھ اخذ کیا۔ وہ ان کے دین اور ان کی باتوں کے شیفتہ ہو گئے۔ چنانچہ زبانیں ان کی تعریف میں رطب اللسان ہوئیں۔ اور مصر کے طول و عرض میں ان کی شہرت پھیل گئی۔ سیّد صاحب نے عقل کو اوہام کے شکنجوں سے آزاد کرانے کی طرف خاص توجہ فرمائی۔ اس سے ذہنوں کو تازگی ملی اور بصیرت میں نئی روشنی پیدا ہوئی۔

سیّد صاحب نے اپنے شاگردوں کو مضمون نگاری پر آمادہ کیا۔ اور وہ مختلف موضوعات پر مقالات لکھنے لگے اور اس میں انھوں نے خاص مہارت حاصل کر لی۔ اس طرح مصر میں انشا پردازی کو بڑی ترقی ہوئی اور اسے کئی مشہور اہل قلم مل گئے۔

یہ وہ چیزیں تھیں، جن کی وجہ سے بعض لوگ ان پر حسد کرنے لگے۔ اور ان کا کتبِ فلسفہ پڑھنا ان کو مطعون کرنے کا ذریعہ بنا لیا گیا، کیونکہ متاخرین کے ہاں ایسا کرنا حرام سمجھا جاتا تھا۔ ان کتبِ فلسفہ میں جو خیالات تھے، حاسدوں نے وہ ان کی طرف منسوب کئے، اور اس بات کو عوام میں بڑی شہرت دی۔ بعض لوگ ایسے بھی تھے جو ان کی مجلس میں جاتے، اور جو کچھ وہاں وہ کہتے، اسے نہ سمجھتے۔ پھر اس کو غلط سلط نقل کر کے انہیں بدنام کرتے۔ لیکن عقلاء اور اہل معرفت کے ہاں ان کا جو مقام تھا، اس قسم کی حرکات سے اس پر کوئی اثر نہ

پڑا۔ بلکہ وہ اور اونچا ہوتا گیا۔ اور دل ان کی طرف برابر مائل ہوتے گئے، یہاں تک کہ خدیو توفیق برسر اقتدار آیا اور اس کے حکم سے انہیں ۱۸۷۹ء میں مصر سے نکال دیا گیا۔[1]

شیخ محمدؐ عبدہ کا سیّد جمال الدین افغانی سے شاگردی و استادی کا جو تعلق تھا، اس کے بارے میں وہ لکھتے ہیں:۔

"میں محرّم ۱۲۸۸ھ (۱۸۷۱ء) کے شروع سے ان کے ساتھ رہا۔ میں نے ان سے ریاضی، حکمت و فلسفہ اور علم الکلام کے سبق پڑھنے شروع کیے۔ اس کے علاوہ میں دوسروں کو بھی آمادہ کرتا تھا کہ وہ سیّد صاحب سے پڑھیں۔ اس پر مشائخ ازہر اور طلبہ کی ایک کثیر جماعت ان کے اور ہمارے خلاف باتیں بنانے لگے۔ ان کا یہ کہنا تھا کہ ان علوم کا حاصل کرنا صحیح عقائد کو متزلزل کر دے گا۔ اور اس سے آدمی ایسی گمراہیوں میں گرے گا کہ وہ دنیا اور آخرت دونوں کی بھلائیوں سے محروم ہو جائے گا۔"

مصر سے سیّد جمال الدّین افغانی کا اخراج محض خدیو توفیق کی وجہ سے عمل میں نہیں آیا تھا۔ بلکہ اس کے پیچھے برطانوی قنصل کا ہاتھ تھا، جو اس وقت مصری حکومت کی مالیات کی نگرانی پر مقرّر تھا۔ الدکتور محمد البہی کے الفاظ میں:۔

"مصر پر برطانیہ کے فوجی قبضے سے تین سال پہلے سیّد جمال الدّین کو برطانوی قنصل کے مشورے سے مصر سے نکالا گیا۔ ان پر الزام یہ تھا کہ وہ بعض سرپھرے نوجوانوں کی جماعت کے صدر ہیں جو دین اور دنیا دونوں میں گڑبڑ کرنا چاہتی ہے"[2]

۱۸۷۹ء میں سیّد صاحب تیسری بار ہندوستان آئے۔ پہلے وہ ایک سال تک حیدر آباد دکن میں رہے۔ وہیں انھوں نے "الردّ علی الدہریین" نام کا رسالہ لکھا۔ جس میں انھوں نے سر سیّد اور ان کی نام نہاد "نیچری تحریک" پر سخت تنقید کی ہے۔ اس رسالے کے مشمولات سے اندازہ ہوتا ہے کہ سیّد صاحب سر سیّد کی

---

[1] یہ مضمون ۱۸۸۵ء میں لکھا گیا تھا۔ جمال الدین افغانی۔ بقلم محمد البوریہ۔

[2] الفکر الاسلامی الحدیث۔ صا۷

انگریز دوستی سے بہت زیادہ خفا تھے، اور اسی خفگی نے ان سے یہ رسالہ لکھوایا۔ بعد میں جب انھوں نے پیرس سے " العروۃ الوثقیٰ " نکالا تو اس میں بھی سرسیّد کی انگریز دوستی پر تنقید ہوتی رہتی تھی۔ سیّد جمال الدین کا خیال تھا کہ سرسیّد اس " نیچریت " کو اس لئے ہوا دے رہے ہیں تاکہ وہ ہندوستان کے مسلمانوں کو انگریزوں کا وفادار بنا سکیں۔

۱۸۸۲ء میں جب مصر میں عرابی پاشا کی قیادت میں انگریزوں کے خلاف جدوجہد شروع ہوئی تو سیّد صاحب کو حیدرآباد دکن سے کلکتہ میں منتقل کر دیا گیا۔ اور وہاں وہ اس وقت تک نظر بند رہے، جب تک مصر پر انگریزوں کا پورا قبضہ نہیں ہو گیا۔ کلکتہ کے دوران قیام میں انھوں نے ایک دفعہ تقریر کرتے ہوئے کہا

" میرے تعجب کی حد نہیں رہتی جب میں ان لوگوں کا خیال کرتا ہوں جو چراغ لے کر شام سے صبح تک شمس بازغہ کا مطالعہ کرتے ہیں لیکن کبھی اس حقیقت پر غور نہیں کرتے کہ جب لیمپ سے چمنی دُور کر لی جائے تو وہ کیوں دھواں دینے لگتا ہے۔ اور جب اس پر چمنی رکھ دی جائے تو کیوں دھواں رک جاتا ہے۔ ایسے علماء اور ان کے اس علم پر افسوس۔ اس سے بھی زیادہ افسوس ناک بات یہ ہے کہ ہمارے مذہبی رہبروں نے علم کو دو حصّوں میں تقسیم کر دیا ہے۔ ایک کو وہ دینی علم کہتے ہیں اور دوسرے کو افرنگیوں کا علم بتاتے ہیں۔ یہ امر کس قدر تعجب خیز ہے کہ آج کے مسلمان کس ذوق وشوق سے افلاطون وارسطو کی تصانیف کا تو مطالعہ کرتے ہیں، لیکن اگر آپ ان کی توجہ گلیلو اور کیپلر کی طرف منعطف کرائیں، تو وہ ان کے علم کو کفر اور حرام قرار دیتے ہیں۔ ان کا خیال ہے کہ ایسا کرنے سے وہ مذہب اسلام کی خدمت کر رہے ہیں۔ حالانکہ درحقیقت وہ اس کے ساتھ دشمنی کر رہے ہیں۔

عرابی پاشا کی بغاوت کے اختتام پر سیّد صاحب کو اجازت مل گئی کہ وہ جہاں چاہیں جا سکتے ہیں۔ چنانچہ وہ کلکتہ سے لندن گئے، اور وہاں سے پیرس۔ جہاں بعد میں شیخ محمّد عبدہ بھی، جنہیں مصر سے جلاوطن کر دیا گیا تھا، اور وہ شام میں مقیم تھے، پہنچ گئے۔ اور دونوں نے مل کر پیرس سے العروۃ الوثقیٰ جاری کیا۔

العروۃ الوثقیٰ کا پہلا شمارہ جمادی الاوّل ۱۳۰۱ھ (۱۳ر مارچ ۱۸۸۴ء) کو نکلا۔ آٹھ ماہ کی مدّت میں اس کے کل آٹھ پرچے شائع ہوئے۔ آخری پرچہ ۲۶ر ذی الحجہ ۱۳۰۱ھ (۱۷ر اکتوبر ۱۸۸۴ء) کو نکلا۔

اور اس کے بعد رسالے کو مجبوراً بند کر دینا پڑا۔ کیونکہ انگریزوں نے مصر اور اپنی دوسری مقبوضات میں اس کا داخلہ بند کر دیا تھا۔ اور مصر میں جس کے پاس رسالہ پایا جاتا، اسے جرمانہ کیا جاتا تھا۔

اس میں شک نہیں کہ العروۃ الوثقیٰ کے اولین مخاطب مسلمان تھے، لیکن اس کے پیش نظر تمام اہل مشرق کے مفادات تھے۔ چنانچہ پہلے شمارے میں رسالے کے اغراض و مقاصد کے ضمن میں یہ لکھا گیا۔

"یہ رسالہ حتی الامکان تمام اہل مشرق کی اس طرح خدمت سر انجام دے گا کہ وہ واجبات جن میں کوتاہی ہوئی اور جس کا نتیجہ زوال اور کمزوری کی شکل میں نکلا، انہیں بیان کرے۔ اور ان راہوں کی نشان دہی کرے جن پر چلنا ضروری ہے۔ تاکہ گزشتہ نقصان کی تلافی ہو سکے اور آنے والے خطرات سے بچا جا سکے۔"

ایک اور مضمون میں جو العروۃ الوثقیٰ کے آٹھویں شمارے (بمطابق ۱۵ رمئی ۱۸۸۴ء) میں شائع ہوا، بعض لوگوں کی اس غلط فہمی کو کہ چونکہ اس کا لہجہ اسلامی ہے، اس لئے یہ صرف مسلمانوں کے لئے خاص ہے۔ ان الفاظ میں دُور کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔

"کوئی شخص یہ نہ سمجھے کہ ہمارا یہ جریدہ خاص طور سے مسلمانوں کا بار بار ذکر اور ان کے حقوق کا دفاع کر کے، ان میں اور ان لوگوں میں جو اپنے وطنوں میں ان کے پڑوسی ہیں، اپنے ملکوں کے مفادات میں ان سے اتفاق رکھتے ہیں اور طویل عرصے سے منافع میں شریک ہیں، افتراق و انشقاق پیدا کرنا چاہتا ہے۔ نہ ہمارا یہ موقف ہے، نہ ہم اس کی طرف میلان رکھتے ہیں۔ نہ ہمارا دین اس کی اجازت دیتا ہے، اور نہ ہماری شریعت اس کی روادار ہے۔ ہمارا مقصد تو تمام اہل مشرق کو بالعموم اور مسلمانوں کو بالخصوص ان پر غیر ملکیوں کی زیادتیوں اور ان کے ملکوں میں ان کی دسیسہ کاریوں سے خبردار کرنا ہے اور اس بارے میں ہم مسلمانوں کو خاص طور سے اس لئے مخاطب کرتے ہیں کہ ان علاقوں میں ان کی غالب آبادی ہے جو غیر ملکیوں کی غداریوں کا نشانہ بنے، وہاں کے سب باشندوں کو انھوں نے ذلیل کیا اور ان کی نعمتوں کو سمیٹ کر لے گئے۔"

پیرس ہی کے زمانہ قیام میں سیّد جمال الدین افغانی کا فرانس کے مشہور مستشرق ارنسٹ رینان سے وہ تاریخی مباحثہ ہوا، جس کا خود موسیو رینان نے بھی ذکر کیا ہے اور سیّد صاحب کے سوانح نگار بھی بڑے اہتمام سے اس کا ذکر کرتے ہیں۔ مارچ ۱۸۸۳ء میں پیرس کی سوربون یونیورسٹی میں رینان نے "اسلام اور علم" کے موضوع پر ایک لیکچر دیا، جس کے ضمن میں یہ کہا "اسلام علمی سرگرمیوں کی حوصلہ افزائی نہیں کرتا، بلکہ وہ ان کی راہ میں حائل ہوتا ہے۔ اور اس کی وجہ اس کا امورِ غیب اور خوارقِ عادات پر اعتقاد اور قضا

وقدر پر مکمل یقین رکھتا ہے۔" سیّد جمال الدین نے ایک فرانسیسی مجلہ "JOURNAL DES DEBATS" میں اس کا جواب دیا، جس کا لب لباب یہ ہے کہ اس بارے میں قابلِ غور امر یہ ہے کہ موسیو رینان نے جن خرابیوں کی طرف اشارہ کیا ہے، کیا وہ دراصل اسلامی عقائد میں ہیں، یا وہ ان قوموں کی ہیں جو اسلام لائیں"۔[1]

اس کی مزید وضاحت کرتے ہوئے سیّد صاحب نے لکھا:۔

"یہ صحیح ہے کہ عربوں نے یونان سے اپنا فلسفہ لیا۔ جس طرح انھوں نے ایران سے وہ چیزیں لیں، جن کے لئے وہ قدیم زمانے سے مشہور تھا۔ لیکن یہ سب علوم جو انھوں نے ان ممالک کی فتح و تسخیر کے ذیل میں لئے، انہیں انھوں نے ترقی دی۔ اس کے دائرے کو وسیع کیا۔ ان کی وضاحت کی اور ان میں وہ مرتبہ کمال کو پہنچے۔ ان علوم کو عربوں نے منطقی ترتیب پر مرتب کیا، جس سے ان کی سلامتی ذوق اور گہرائی کا اندازہ ہوتا ہے۔ بے شک اس زمانے میں فرانسیسی جرمن اور انگریز روما اور بازنطینی قسطنطنیہ سے نیز عربوں سے جن کا پایۂ حکومت بغداد تھا، زیادہ دُور نہ تھے، اور ان کے لئے بڑا آسان تھا کہ وہ ان دونوں تہذیبوں کے مدفون علمی خزانوں سے فائدہ اٹھاتے۔ لیکن انھوں نے یہ نہیں کیا۔ یہاں تک کہ وہ دن آیا جب عربی تہذیب کا منارۂ روشنی پیرانیز کی چوٹی پر جلوہ افگن ہوا۔ اس نے مغرب کو اپنی روشنی سے منور کیا اور یورپ والے اس وقت ہی صحیح معنوں میں ارسطو کا استقبال کر سکے، جب وہ عربی جامے میں ملبوس ان کے پاس پہنچا۔ جب تک وہ ان کے قریب ہی یونانی جامے میں رہا، اس کے متعلق انھوں نے کبھی سوچا ہی نہیں"۔

رینان نے اپنے لیکچر میں درحقیقت مذہب اور فلسفہ کی بحث اٹھائی تھی۔ اور مذہب کو فلسفہ یعنی آزادی فکر کا مخالف ثابت کرنے کی کوشش کی تھی۔ سیّد صاحب نے آخر میں اس بارے میں لکھا۔ عقیدے اور فکرِ آزاد یا دین اور فلسفہ کی باہمی لڑائی اُس وقت تک جاری رہے گی، جب تک کہ انسانیت کا وجود ہے۔ اور میرا خیال ہے کہ اس سخت لڑائی میں فکرِ آزاد کے حصے میں فتح نہیں ہوگی۔ کیونکہ محض عقل جمہور عوام کے حسب حال نہیں ہوتی اور اس کی تعلیمات ایک منتخب روشن خیال طبقہ ہی سمجھ سکتا ہے۔ علم اپنے تمام حسن و جمال کے باوجود انسانیت کو پوری طرح راضی نہیں رکھ سکتا۔ وہ ہمیشہ ایک مثلِ اعلیٰ اور آئیڈیل کے لئے پیاسی رہے گی اور دُور دراز تاریک وسعتوں میں پرواز کرنا چاہے گی، جہاں تک فلسفیوں کی رسائی نہیں ہو سکتی"۔

---

[1] الفکر الاسلامی الحدیث، تالیف ڈاکٹر محمد البہی، صـ ۸۶

موسیو رینان نے سیّد صاحب کے اس مضمون کا بڑے اچھے انداز میں جواب دیا اور اس ضمن میں لکھا:-

"شیخ جمال الدّین کی بعض اہم آراء سے، جن سے انھوں نے مجھے مستفید کیا،
میرے اس بنیادی نظریئے کی تائید ہوتی ہے کہ اسلام اپنے تاریخی وجود کے نصف
اوّل میں اسلامی ممالک میں علمی ترقی کی راہ میں روک نہیں بنا۔ لیکن نصف آخر میں
اس نے بے شک علمی ترقی کا گلا گھونٹا۔"

موسیو رینان سیّد صاحب سے ملا بھی تھا۔ وہ اس ملاقات کا ذکر اپنی کتاب میں ان الفاظ میں کرتا ہے:

"کوئی دو ماہ ہوئے شیخ جمال الدین افغانی سے میرا تعارف ہوا۔ بہت کم لوگ ہوں گے جو میرے دل پر اس طرح اُترے ہوں گے جیسے کہ وہ۔ انھوں نے مجھے بہت زیادہ متاثر کیا۔ ہمارے درمیان علم اور اسلام کے باہمی تعلق کے بارے میں گفتگو بھی ہوئی۔ جب میں ان سے باتیں کر رہا تھا اور انہیں اپنے سامنے دیکھ رہا تھا تو ان کی آزادیِ فکر، شرافت اور صاف گوئی سے میں نے یوں محسوس کیا، جیسے میرے سامنے ان قدماء میں سے جنہیں میں جانتا ہوں، کوئی بزرگ ہیں اور ابن سینا، ابن رشد یا ان عظیم ملحدوں میں سے کسی کو دیکھ رہا ہوں جو گزشتہ پانچ صدیوں سے انسانیت کو غلامی سے آزاد کرانے کے لئے جد و جہد کر رہے ہیں۔

العروۃ الوثقی کے بند ہو جانے کے بعد سیّد جمال الدین افغانی کی تمام تر سرگرمیاں بین الاقوامی یا زیادہ صحیح الفاظ میں بین الاسلامی اور بین المشرقی سیاسیات کے دائرے تک محدود ہو کر رہ گئیں۔ ان کے ایک آئرلینڈی دوست مسٹر بلنٹ تھے، جنہوں نے سیّد صاحب کو ایک دفعہ لندن میں لارڈ چرچل اور لارڈ سالسبری سے ملوایا۔ ان دونوں نے سیّد صاحب سے سوڈان میں مہدی سوڈانی کی بغاوت کو فرو کرنے کے بارے میں امداد چاہی تھی۔ وہ دو بار ایران گئے۔ دوسری بار شاہ ایران نے انہیں ایک اعلیٰ عہدے پر فائز کیا۔ لیکن وہ جلد ہی سیّد صاحب سے برگشتہ خاطر ہو گیا۔ اور انہیں بہت بُری حالت میں ایران سے نکلوایا۔ جس کا انتقام سید صاحب کے ایک شاگرد نے اس طرح لیا کہ شاہِ ایران اس کے ہاتھ سے ہلاک ہُوا۔ وہ چار سال تک روس میں رہے، اور روس میں آباد ترکوں کی دینی و قومی بیداری میں ان کا بڑا حصہ ہے۔ روسی ترکوں کے مشہور مصلح و مفکر محمّد اسمٰعیل گیسپرنسکی[1] سیّد صاحب سے بہت زیادہ متاثر تھے۔ وہ ۱۸۹۲ء میں لندن میں تھے کہ ترکی سلطان عبد الحمید

---

[1] اسمٰعیل بے گیسپرنسکی تاتاریوں کی تعلیمی ترقی اور ان کے قومی احساسات کی بیداری کے (باقی اگلے صفحہ پر*)

نے انہیں استنبول بلا بھیجا۔ چنانچہ اپنی زندگی کے باقی پانچ سال انھوں نے استنبول ہی میں گزارے۔ کہا جاتا ہے کہ استنبول میں سیّد صاحب ایک لحاظ سے زیرِ حراست تھے اور ان کی موت کے بارے میں بھی یہ شبہ کیا جاتا ہے کہ سلطان عبدالحمید نے انہیں زہر دلوایا تھا۔ سیّد جمال الدّین افغانی کا انتقال ۹ مارچ ۱۸۹۷ء کو ہوا۔

سید جمال الدین افغانی ہر لحاظ سے ایک غیر معمولی اور عدیم المثال شخصیت تھے۔ گزشتہ کئی صدیوں میں پوری دنیائے اسلام پر کسی ایک شخصیت کا اتنا ہمہ گیر، دوررس، انقلاب آفرین اور گہرا اثر نہیں پڑا، جتنا ان کا پڑا ہے۔ وہ بیک وقت عالمِ دین بھی تھے اور دینی مصلح بھی۔ اجتماعی و سیاسی امور میں نظر غائر رکھنے والے بھی اور ان کی اصلاح کے داعی بھی۔ وہ تمام قدیم اسلامی علوم پر بھی حاوی تھے اور جدید علوم سے بھی متعارف تھے۔ سیاسیات کا انہیں وسیع اور عمیق تجربہ تھا۔ اور اس کے پیچ و خم سے خوب واقف تھے۔ پھر ان میں سب سے بڑی بات یہ تھی کہ وہ مردِ فعّال تھے اور کر گزرنے کا حوصلہ اور ہمّت رکھتے تھے۔ یہی وجہ

(* پچھلے صفحہ سے آگے) علمبردار تھے، انیسویں صدی میں روسی ترکوں کی تاریخ میں گیسپرنسکی (۱۸۵۱ء-۱۹۱۴ء) کی شخصیت سب سے ممتاز ہے۔ انھوں نے کریمیا اور ماسکو میں تعلیم پائی تھی۔ بعد میں وہ استنبول میں رہے۔ اور وہاں سے پیرس گئے۔ وہ ایک طرف نوجوان عثمانی ترکی تحریک سے متاثر ہوئے، اور دوسری طرف پان اسلامزم کی تحریک، جس کے بانی جمال الدین افغانی تھے، ان کے لئے منبع فیض بنی۔

نظری لحاظ سے اسماعیل بے گیسپرنسکی اگرچہ تمام دنیائے اسلام کے اتحاد کے حامی تھے، لیکن عملاً ان کی دعوت روس کے تمام مسلمانوں کو متحد کرنے کی تھی۔ اس کے ساتھ ساتھ وہ ترکوں کو قرونِ وسطیٰ کی ذہنیت سے نکال کر جدید یورپی ثقافت کے دائرے میں لانا چاہتے تھے۔ وہ مسلمان عورتوں کی آزادی کے حامی اور مسلمانوں کی سماجی زندگی میں بعض اصلاحات کے داعی تھے، لیکن وہ اسلامی ثقافت کے بھی مؤید تھے۔

گیسپرنسکی کی توجہ زیادہ تر تعلیم کی طرف رہی۔ انھوں نے خود ایک اصلاح شدہ نظامِ تعلیم کا مدرسہ قائم کیا، جو بعد میں نئے طریقۂ تعلیم یعنی "اصول جدید" کے مدارس کے لئے نمونہ بن گیا۔ اس نئے قسم کے مدارس میں عربی پڑھانے کا نیا طریقہ رائج کیا گیا، اور اگرچہ ان مدارس میں قرآن مجید اور فقہ کی تعلیم بحالہ جاری رہی، لیکن اس کے ساتھ ساتھ ریاضی، تاریخ اور جغرافیہ بھی شامل نصاب کیا گیا (ماخوذ از پان ترکزم اینڈ اسلام اِن رشیا مصنّفہ زنکووسکی)

تھی کہ وہ جہاں جاتے، باحوصلہ لوگ ان کے ارد گرد جمع ہوجاتے۔ اور وہاں دینی و سیاسی اصلاح اور فکری و ادبی بیداری کی تحریک شروع ہوجاتی۔

مشہور کتاب "جدید عالمِ اسلام" کے امریکی مصنف لوتھراب کے الفاظ میں" اسلامی ملکوں میں سے کوئی ملک ایسا نہیں، جس کی زمین پر جمال الدین کے پاؤں پڑے ہوں، اور وہاں ایک فکری و اجتماعی بغاوت نہ نمودار ہوئی ہو، جس کی آگ پھر کبھی نہ بجھتی......

شیخ محمد عبدہ نے اپنے عظیم استاد کی شخصیت کا خاکہ یوں پیش کیا ہے :۔

" جہاں تک ان کے اخلاق کا تعلق ہے، سلامتیِ قلب ان کے تمام اوصاف پر غالب تھی۔ ان میں بڑی بُردباری تھی، جس کی وسعت میں وہ سب کچھ آجاتا جو اللہ چاہتا۔ لیکن اگر کوئی ان کی عزت یا ان کے دین کے درپے ہونے کے لئے ان کے پاس آتا تو ان کی بردباری غضب اور غصے میں بدل جاتی، جس سے کہ شعلے نکلتے۔ چنانچہ ابھی وہ بُردبار درگزر کرنے والے ہوتے اور پھر وُہ حملہ کرنے والے شیر ہوجاتے۔ وہ بڑے سخی اور فیاض تھے، جو کچھ ان کے پاس ہوتا، خرچ کر دیتے۔ اللہ پر انہیں بڑا اعتماد تھا اور زمانے کی مصیبتوں کی مطلق پروا نہ کرتے تھے۔ بڑے امین تھے۔ جو اُن کے ساتھ نرم ہوتا، اس سے نرمی برتتے۔ اور جو اُن کے ساتھ سختی کے ساتھ پیش آتا۔ اس سے سخت ہوتے۔ اپنے سیاسی مقصد میں بڑے حوصلہ مند تھے۔ اگر اس کے متعلق امید کی کوئی شعاع نظر آتی، تو اس تک پہنچنے میں جلدی کرتے، اور اکثر یہی جلدی محرومی کا باعث بنتی۔

" دنیا کی انہیں بہت کم حرص تھی۔ اور اس کی ظاہری آرائشوں کو وہ خاطر میں نہیں لاتے تھے۔ بڑے کاموں سے شیفتگی رکھتے۔ چھوٹے چھوٹے کاموں سے اعراض برتتے۔ شجاع اور آگے بڑھنے والے تھے، موت سے نہیں ڈرتے تھے، جیسے وہ موت کو جانتے ہی نہیں۔ لیکن وہ مزاج کے تیز تھے اور اکثر

یہ تیزی ان کی ذہانت کے کیے کرائے پر پانی پھیر دیتی۔ اس کے باوجود وہ ایک مستحکم پہاڑ تھے۔"

مسٹر بلنٹ سید جمال الدین افغانی کے متعلق لکھتے ہیں :۔

" ان کی غیر معمولی ذہانت یہ تھی کہ وہ جن ملکوں میں گئے ، وہاں کے مسلمانوں کو اس امر پر آمادہ کرنے کی جدوجہد کی کہ وہ موجودہ اسلامی صورتِ حال کے متعلق پوری طرح نظرِثانی کریں۔ قدامت سے چمٹے رہنے کے بجائے آگے بڑھیں اور جدید علوم سے ہم آہنگ علمی و فکری تحریکوں کو وجود میں لائیں۔ قرآن و سنت کے علم تام نے انہیں اس قابل بنا دیا تھا کہ وہ دلائل سے ثابت کر سکتے تھے کہ اگر قرآن و سنت کی صحیح طرح تعبیر و تشریح ہو، تو اسلام عظیم ترقی کو بروئے کار لا سکتا ہے۔ اور مسلمان ایک طرف اپنے رب اور دوسری طرف انسانیت جو ترقی یافتہ سے ترقی یافتہ آرزوئیں رکھتی ہے اور نئی زندگی جو کچھ بھی چاہتی ہے ان کے درمیان پوری ہم آہنگی پیدا کر سکتا ہے۔"

سیّد جمال الدین افغانی کی نظر مستقبل میں کتنا دُور دیکھتی تھی، اس کا اندازہ اس پیش گوئی سے کیجیے، جو آپ نے اپنے ایک شاگرد عبدالرشید تاتاری سے دورانِ گفتگو میں کی تھی۔ آپ نے فرمایا :۔

یاولد انک ستصلی صلاۃ الجنازۃ علی القیصریۃ الروسیۃ و ستحضر تشییع جنازۃ الامبراطوریہ الانجلیزیۃ فی الھند۔

" عزیزم! تم عنقریب روسی قیصریت کی نماز جنازہ پڑھو گے اور ہندوستان کی انگریزی شہنشاہیت کے جنازے کے ساتھ چلو گے۔"